باب5

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی پنجابی نثر

پنجابی نثر اور مواعظ نوشہؒ

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو زبان جتنی قدیم ہوگی اُس کا ادب بھی اتنا ہی قدیم ہوگا۔ پنجابی زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس دھرتی میں اس کی جڑیں گہری اور قدیم ہیں۔ بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے لے کر آج تک تقریباً آٹھ سو سال کا طویل عرصہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں تخلیق ہونے والا پنجابی ادب تحریری صورت میں موجود ہے۔ ادب کی اصطلاح میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔

پنجابی زبان کی ابتداء کے متعلق جدید تحقیق نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اس کا تعلق داروڑی قبیلے کی زبانوں سے ہے۔ اس حوالے سے اس زبان کی کم از کم عمر پانچ ہزار برس مقرر کی جاسکتی ہے۔ مگر اُس وقت پنجابی زبان دوسری زبانوں کے اندر سفر کر رہی تھی۔ اُسکی علیحدہ شکل وصورت 712ء میں محمد بن قاسم کے ہندوستان پر حملہ کے بعد نظر آنے لگی، جب ہندوستان میں مسلم ریاست کے خدوخال واضح ہوئے۔ اس سے قبل بھی عرب کے تاجر ہندوستان آتے تھے۔ لیکن محمد بن قاسم کے ہندوستان پر حملے کے بعد تاجروں کے ہمراہ علماء وصوفیا بھی یہاں آنے لگے۔ انہوں نے ہندوستان کے ظلمت کدے میں اسلام کی شمع روشن کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اس ضمن میں افغانستان سے آنے والے صوفیائے کرام کی خدمات خاص طور پر قابل قدر ہیں۔

انہوں نے دین اسلام کی تبلیغ میں بے حد محنت و مشقت سے کام لیا۔ اسلامی تبلیغ کا یہ سلسلہ نویں ودسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور گیارہویں صدی عیسوی میں باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس صدی کے بزرگان دین میں سے حضرت اسماعیل نے تقریباً 1005ء کے نزدیک لاہور کے گرد و نواح کو تبلیغ کے لئے منتخب کیا اور ہزارہا لوگوں کے سینے اسلام کی روشنی سے منور کئے۔ ان کے بعد ملتان کے علاقے میں تقریباً 1070ء میں اسماعیلیہ فرقے کے اٹھارہویں امام سیدنا مستنصر باللہ المعروف ست گورنور نے یہاں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے بعد شاہ شمس سبزواری (1165ء تا 1276ء) پیر شہاب الدین ،حسن کبیر حسن دریائی اور پیر تاج الدین نے اس سلسلے کو مزید وسعت دی۔ ان بزرگوں نے لوگوں کو پندونصائح کے لئے زبانی ہدایات کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔ اُن کے کلام کو گنان کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ گنان لوہانکا رسم الخط میں بتائے جاتے ہیں۔ ان بزرگان دین کا زمانہ تقریباً 1467ء تک بنتا ہے۔ اس طرح نویں صدی سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی تک کا ادبی سرمایہ نظم کی صورت میں موجود ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا درست نہ ہوگا کہ اُس زمانے میں نثر کا وجود نہ تھا یا نثر گفتگو کے لئے استعمال نہ ہوتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زبان ہمیشہ اُسی وقت شاعری کے سانچوں میں ڈھلتی ہے جب نثری اعتبار سے پختہ تر ہو جاتی ہے۔ زبان کو عوام آپس میں گفتگو کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی باتیں سمجھتے ہیں اور سمجھاتے ہیں اور آپس میں لین دین اور روز مرہ کی ضروریات و احتیاجات زبان کے ذریعے پوری کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے نثر کا وجود نظم سے قدیم تر بنتا ہے۔ لیکن دیگر جملہ السنہ کی مانند پنجابی زبان میں بھی قدیم ترین ادبی نمونے نثر کی بجائے نظم میں موجود ہیں۔ اسی لئے نثر کی تخلیق کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ البتہٰ یہ بات پورے وثوق کیساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب میں جن صوفیائے کرام نے دین اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا، خواہ وہ مقامی تھے یا بیرونی

ممالک سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، انہوں نے یہاں کی مقامی زبان سیکھی اور پھر اُس میں تبلیغ کی۔ پنجابی زبان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آج سے ایک ہزار برس قبل پنجاب میں وہی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی جو آج کل ہم بولتے، سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ البتہ ہزار برس کے سفر میں کئی قدیم الفاظ متروک ہو چکے ہیں اور دیگر زبانوں کے کئی ایک نئے الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم پنجابی پڑھتے ہوئے بعض دفعہ دِقت پیش آتی ہے۔ لیکن یہ کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔ زبانوں کے سلسلے میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ زندہ زبانوں کو ہمیشہ ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ورنہ زبان کا ارتقاء رُک جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے صوفیاء نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے پنجابی نثر کا ضرور سہارا لیا ہوگا۔ اگرچہ اُس دور کی پنجابی نثر تحریری صورت میں ہمارے پاس موجود نہیں۔ البتہ اُس دور کی صوفیانہ شاعری سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اُس زمانے میں پنجابی نثر کی زبان کیسی ہوگی؟ پنجابی زبان کے سب سے پہلے شاعر بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہیں، جن کا کلام شلوکوں کی صورت میں دستیاب ہے۔ اُن کے کچھ عرصہ پہلے حاجی بابا رتن کا نام آتا ہے۔ اُن کا صرف ایک نعتیہ شعر ملتا ہے:

رُوپا محمدؐ سونا خدائی دوہوں وچ دنیا غوطہ کھائی
حاجی بابا رتن ایسی کہیں ہمتے نیارا رہیں

حاجی بابا رتنؒ کے مقابلے میں بابا فریدؒ کی زبان صاف اور آج کی زبان جیسی ہے:

رُکھی سکی کھاءِ کے ٹھنڈا پانی پی
فریدا ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی[1]

بابا فریدؒ کے کلام میں مستعمل پنجابی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور تک پنجابی زبان نے اپ بھرنش اور برج بھاشا سے رشتہ توڑ کر اپنا الگ روپ اختیار کر لیا تھا

1- آکھیا بابا فرید نے ص 172

اور یہ عوام کی بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ اس میں روزمرہ اور محاورے پیدا ہو چکے تھے۔ روزمرہ تو تب ہی وجود میں آتا ہے جب لوگ آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی طرح برسوں کے تجربات و مشاہدات کے بعد محاورے اور آکھان وجود میں آتے ہیں۔ بابا فریدؒ کے کلام میں رنگ برنگے محاورے اس امر کے شاہد ہیں کہ اُس زمانے میں پنجابی زبان ایک مکمل اور پختہ زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ صرف ایک شلوک دیکھئے:

فریدا جے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
اپنے گریوان میں سر نیواں کرکے دیکھ

اس شلوک میں محاورہ ''گریبان میں جھانکنا'' استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بابا فریدؒ کے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدِ خاص امیر خسرو (1253ء۔ 1325ء) کے پنجابی میں دوہے، لطیفے اور پہیلیاں مشہور ہیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے امیر خسرو کی تقریباً چالیس بجھارتوں کا ذکر کیا ہے۔[1] ان بجھارتوں کی ساخت بالکل شعر یا مصرعے جیسی ہے۔ لیکن کہیں کہیں نثر کا سا انداز بھی ہے۔ تاہم اُن کو نثر کے مکمل نمونے نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً چند بجھارتیں دیکھئے:

1- پاروں آیا لشکری، جاندا جاندا کر گیا مشکری
2- نکا جیہا ویہڑکا، دو سنگیاں مارے
3- چونے گچ حویلی، بوہا کوئی نہ
4- عجب ڈٹھی اک کڑی، راجے پگ لہائے

بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ صاف زبان امیر خسرو کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اُن کے خیال کے مطابق یہ بجھارتیں اُن کی نہیں بلکہ اُن سے منسوب کی گئی ہیں۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں بابا فریدؒ کی پنجابی زبان بھی دیکھی ہے جو بے حد صاف اور

1- موہن سنگھ دیوانہ، ڈاکٹر: پنجابی زبان دی مختصر تاریخ ص 28

عام فہم ہے جبکہ بابا فریدؒ کا زمانہ امیر خسرو سے پہلے کا ہے۔ اسلئے ان بجھارتوں کی زبان کا اس قدر صاف ہونا کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بابا نانک (1449ء ۔ 1539ء) سامنے آتے ہیں۔ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن مسلمان صوفیاء سے بے حد متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے بت پرستی کی بجائے وحدت کا راستہ اختیار کیا اور بابا فریدؒ کا کلام (اُس دور کے بابا فریدؒ کی درگاہ کے گدی نشین) ابراہیم فرید ثانیؒ کی اجازت سے گرنتھ میں شامل کیا۔ شیخ فرید ثانیؒ اور بابا نانک جی کے مابین جو سوال و جواب ہوئے وہ اُن کے بعض عقیدت مندوں نے گوشٹوں کے روپ میں محفوظ کر لئے۔ موہن سنگھ دیوانہ نے اپنی تاریخ میں ان سوالات و جوابات کو نقل کیا ہے۔ زبان کا اندازہ لگانے کے لئے اُن میں سے چند سطریں نمونے کے طور پر پیش ہیں:

سوال نانک جی: پڑھتے پڑھتے دند گھسے کسے نہ کیتی ہو

جواب شیخ فرید ثانی: ایکو حرف پریم دا پڑھے سو پنڈت ہو

سوال نانک جی: صاحب دیاں دو حداں، کس نوں پکڑاں کس نوں چھڈاں

جواب شیخ فرید ثانی: صاحب کی دو حد، سچ نوں پکڑ کوڑ نوں چھڈ

نانک جی نے ہندو گھرانے میں تربیت پائی تھی اس لئے اُن کی اپنی زبان پر سنسکرت اور بھاشا کا خاصا اثر تھا۔ اُن کے بعد اُن کے عقیدت مندوں نے ان کی جنم ساکھیاں تحریر کیں۔ اُن میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس پر زیادہ اثر برج بھاشا کا ہے۔ لہٰذا اُن کی تحریریں پنجابی نظم و نثر کے اعلیٰ نمونے بننے کی بجائے سنسکرت اور برج بھاشا کے نمونے بن گئیں۔ اُن میں بعض شلوک تو بالکل ہی سنسکرت اور برج بھاشا کے لگتے ہیں۔ اُن میں پنجابی، عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ سکھ مذہب کے پانچویں گورو ارجن نے 1601ء کے قریب گرنتھ مرتب کیا۔ انہوں نے بھی برج بھاشا زبان کو اپنایا۔ بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ اس رنگ کو مزید گہرا

اور پختہ کیا۔ اس لئے اُن کے بعد دیگر گورو صاحبان نے بھی اُن کی تقلید کو قابل فخر سمجھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں نوشہ گنج بخشؒ جیسی عظیم ہستی نظر آتی ہے جس نے نظم و نثر ہر دو حوالوں سے قابل ذکر ادب تخلیق کیا۔

گذشتہ اوراق میں ہم نے نوشہ صاحبؒ کی پنجابی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اب ہم یہاں اس سارے پس منظر میں ان کی پنجابی نثر کا جائزہ لیں گے۔

بابا فریدؒ سے لے کر نوشہ گنج بخشؒ کے دور تک کے پنجابی ادب پر نظر ڈالیں تو بلاشبہ شاعری کے قابل فخر مجموعے دکھائی دیتے ہیں۔ اُس شاعری کی پختگی کو دیکھ کر اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُس دور میں پنجابی نثر اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود ہوگی۔ جس کی شہادت امیر خسرو کی پہیلیوں سے ملتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہیلیاں دراصل نثری نمونے تھے۔ ان کو دلچسپ بنانے کے لئے موزوں مصرعوں کا روپ دیا گیا۔ حالانکہ اِن میں بہت سی ایسی ،بجھارتیں ہیں جن میں نہ تو مصرعے کا سا وزن ہے اور نہ ہی اُن میں شعری حسن ہے۔ اس کے باوجود ہم اُن کو رواں نثر کی خوبصورت مثالیں قرار نہیں دے سکتے ہیں۔ یہی حال گورو صاحبان کی گوشٹوں کا ہے جن میں سنسکرت ، ہندی اور برج بھاشا کے الفاظ کی بلا جواز بھر مار ہے چنانچہ انہیں بھی پنجابی نثر کے اعلیٰ نمونے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے باوجود یہ تمام باتیں اس امر کی شہادت ضرور بن سکتی ہیں کہ بابا فریدؒ سے لے کر نوشہ گنج بخشؒ کے دور تک پنجابی زبان خصوصاً نثر اس قابل ضرور ہوگی کہ اس میں کچھ نہ کچھ تحریر ضرور کیا گیا ہوگا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کیا لکھا گیا ہوگا اور اُس کا معیار کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں اُس وقت تک کوئی بات وثوق سے کہنا مشکل ہے جب تک اُس دور کی نثر کا کوئی پختہ نمونہ نہیں مل جاتا۔

اس تمام تر پس منظر میں نوشہ گنج بخشؒ کے مواعظ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق نوشہ صاحبؒ کے یہ مواعظ

پنجابی نثر کا قدیم ترین نمونہ ہیں۔

ان مواعظ کا فکری اور لسانی تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ اُن کے مواعظ کا مختصر فکری تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر اُس کے بعد لسانی حوالے سے ان مواعظ سے متعلق گفتگو ہوگی۔

مواعظ کا فکری تجزیہ

جدید تحقیق کے مطابق اب تک نوشہ صاحبؒ کے چھ وعظوں کا سراغ مل چکا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں یہ وعظ الگ الگ نظر آتے ہیں۔لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے اُن تمام وعظوں میں فطری ربط موجود ہے اور یہ سچے موتیوں کی مانند ایک ہی ہار میں پروئے ہوئے معلوم پڑتے ہیں۔کسی بھی تحریر کا فکری جائزہ لینے کے لئے دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ پہلے یہ کہ اس تحریر سے مصنف کا کیا مقصد ہے؟ دوسرے یہ کہ مصنف نے اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے کون سے لسانی نظام کا سہارا لیا ہے۔ کیونکہ افکار و احساس کے اظہار کے لئے زبان یا الفاظ ہی بہترین وسیلہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان الفاظ کے استعمال سے واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف اپنے افکار و جذبات دوسروں تک پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

نوشہ صاحبؒ کے مواعظ کے فکری پہلو پر غور کرتے ہوئے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ ان مواعظ کے ذریعہ اپنے صوفیانہ نظریات اور مبلغانہ افکار کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان مواعظ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ذریعے نوشہ صاحبؒ دین اسلام کے سچے اصولوں کو خدا کی مخلوق تک پہنچانا چاہتے ہیں تا کہ لوگ ان اصولوں سے نہ صرف آ گاہ ہو جائیں بلکہ اُن پر مکمل طور پر عمل پیرا بھی ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نوشہ صاحبؒ نے کوئی فلسفیانہ یا ناصحانہ انداز نہیں اپنایا اور نہ ہی شریعت کے دقیق مسائل زیر بحث لائے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں کو

نہایت سادہ الفاظ اور عام فہم انداز میں لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ اُن کے مقصد کی سچائی پڑھنے اور سننے والوں پر اپنے آپ ہی واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ وعظ کے آغاز میں نہ تو طویل تمہید باندھتے ہیں اور نہ ہی کسی اور طریقے سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔ بلکہ جو بات وہ بیان کرنا چاہتے ہیں براہ راست آغاز اسی بات سے کرتے ہیں جو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اُس بات کی وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے اُن کے پہلے وعظ کا موضوع توحید خداوندی ہے۔ چنانچہ وہ وعظ کا آغاز ہی اس بات سے کرتے ہیں کہ:

''بابا۔ سائیں والیاں فرمایا ہے۔ جو سائیں خودمختار ہے۔ جو مندا ہے سو بندہ ہے۔''(1)

نثر کے اس مختصر سے ٹکڑے میں نوشہ صاحبؒ اسلامی فلسفہ حیات کی دو اہم باتیں نہایت سادہ انداز میں بیان کر گئے ہیں۔ پہلی بات اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کی اور دوسری بات انسان کے بندہ ہونے کی ہے۔ ان دو باتوں کو بنیاد بناتے ہوئے آپ آگے چل کر ایک مومن اور ایک کافر کی زندگی کا فرق واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک کافر کی زندگی کا خاتمہ کیسے ہوتا ہے اور اُس کا انجام کس قدر عبرت ناک اور دردناک ہوگا، جبکہ اس کے مقابلے میں توحید باری تعالیٰ تسلیم کرنے والے ایک مومن کا انجام خیر پر ہوگا۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لا کر صراط مستقیم اختیار کرتے ہیں، نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں اُن کے لئے خوشیاں اور کامیابی ہے۔ یہی لوگ نیک نصیب ہوں گے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

''مومناں دی جند خوشی نال سوکھی سکھالی نکل کے اپنے اصلی دیس مقام نوں جا پہنچدی اے۔ کیوں جو اوہ تاں دنیا دی صحبت دے عاشق مشتاق ناہیں۔ ہتھوں پندھاں توں چھٹ پوندے ہین۔ پردیسوں مڑ دیس

1- مواعظ نوشہ پیر۔ تاج بکڈپو، لاہور 1973ء ص 37

پہنچدے ہین۔ وطن دی خوشی نال پل ڈھل لاؤندے ناہیں۔ تاں تے مومناں دی روح واسطے ملائیک تسبیحاں کردے عرشوں اُتر کے آ گا لیندے ہین تے بہشت لے جاوندے ہین۔ واہ واہ طالع بخت تنہاں دے جنہاں نوں ایڈا آدر ملدا ہے''(1)

نوشہ صاحبؒ نے اپنے ان مواعظ میں قرآن مجید میں درج مختلف انبیاءعلیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کے واقعات بیان کئے ہیں اور اُن کی روشنی میں نیکی اور بدی میں تمیز واضح کی ہے تا کہ لوگ قدیم اُمم کے عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہدایت کا راستہ اپنائیں اور اللہ والوں کو خوامخواہ تنگ کرنے کی بجائے اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوں اور اپنی آخرت سنوارنے کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص نیکی کی طرف راغب نہیں ہوتا، اُسے واضح انداز میں فرماتے ہیں:

'' جو کوئی نت مندائی کردا ہے تس دے ہاؤں تے وساری دا کٹ ہوئیکے ودھدے ودھدے بجھ جاوندا ہے تے ہاؤں کالا کر دیندا ہے۔ پر کٹ گھناں تاں لوہ تے جمدا ہے تے ایویں لوہ وانگن جیندا ہاؤں ہووندا ہے تس تے کٹ بہوں ہووندا ہے تے جاں ہاؤں کالا ہویا تاں سائیں دی سمہالوں گھتھا تے بالن بھاہ دا ہویا۔ انت پچھتاوی تے دُھکھ دُھکھ بلسی سڑسی۔ پھر کسے پرویلا اجوکا نہ لبھسی۔''(2)

مطلب یہ ہے کہ جو شخص بار بار برائی کرتا ہے وہ برائی کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر وہ بدی کرتے ہوئے شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا، اُس کے دل پر قدرت کی طرف سے کالا داغ بن جاتا ہے، جو دھیرے دھیرے پختہ ہو جاتا ہے۔ جب یہ داغ مزید پکا ہو جاتا ہے تو پھر سمجھو کہ دل مردہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا

1- مواعظہ نوشہ ص28,29

2- ایضاً 42,43

ہے۔ ایسے دل کا مالک شخص کبھی بھی نیکی کی طرف نہیں پلٹا۔ قرآن پاک میں ایسے ہی لوگوں کا آخری ٹھکانہ دوزخ کی آگ بتایا گیا ہے۔ جہاں سے نجات ناممکن ہے۔ اس لئے اس دنیا کی زندگی کو غنیمت جان کر برائی کے راستے کو چھوڑ کر صراط مستقیم اختیار کرنا چاہیے۔ اسی میں اُسکی فلاح مضمر ہے۔ نوشہ صاحبؒ نے اپنے ان مواعظ میں سادہ انداز سے تجویز دی ہے اور ہدایت کی ہے کہ بھٹکے ہوئے لوگ سیدھی راہ اختیار کر سکتے ہیں اس کے لئے انہیں برائی چھوڑ کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں:

''پر ایہہ واٹ سائیں والیاں نال ملیاں سچے ساتھ رلیاں، سچیاں گلاں سنیاں سمجھیاں، سچیاں دے آکھے لگ ٹریاں چلیاں لبھدی ہے۔ ایویں سکھالی ناہیں لبھدی۔''(1)

دیکھنے میں تو یہ راستہ آسان نظر آتا ہے۔ مگر جس قدر یہ آسان دکھائی دیتا ہے اُسی قدر اُس پر چلنا دشوار ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر جلد برائی کی طرف مائل ہوتا ہے اُسی قدر مشکل سے نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ کیونکہ برائی کی لذّت اور پھل کا مزہ اُسے فوراً حاصل ہو جاتا ہے جبکہ نیکی کے پھل کے حصول میں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ برائی کی لذّت عارضی ہے اور نیکی کے عوض ملنے والا پھل ہمیشہ رہنے والا اور ابدی ذائقے والا ہے، پھر انسان نیکی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

نوشہ صاحبؒ کے نزدیک تمام برائیوں کی جڑ جھوٹ ہے۔ انہوں نے اپنے وعظوں میں اسی بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ اگر کوئی شخص صرف جھوٹ کی بیماری سے چھٹکارا حاصل کر لے تو پھر سمجھو کہ وہ ہر برائی سے محفوظ ہو گیا۔ نوشہ صاحبؒ نے اپنی بات کو دلچسپ بنانے کے لئے موقع محل کے مطابق شعر بھی استعمال کئے ہیں جس سے ان کی تحریر میں ادبی حسن پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً تیسرے وعظ کے آخر میں یہ مصرعے درج ہیں:

1- مواعظ نوشہ۔ تیسرا وعظ ص 47,48

کیہ لیسیں سچیا گوڑ تھوں کیہ لیسیں سچیا گوڑ تھوں
کجھ چانن ہوئے نہ دھوڑ تھوں کیہ لیسیں سچیا گوڑ تھوں
جو دِسے سو ٹُھر ہے نہیں بن سائیں ہور دِھر ہے نہیں
ایتھے رہنا کجھ چر ہے نہیں کہ لیسیں سچیا گوڑ تھوں[1]

شہنشاہ اکبر کے عہد سلطنت میں دین الٰہی کی بنیاد رکھے جانے کی وجہ سے اسلام کا جس طرح تمسخر اڑایا گیا، وہ سب پر عیاں ہے۔ اُس نے جہاں اسلام کے دیگر ارکان کو ساقط کیا وہاں اسلام کے بنیادی رکن کلمہ طیبہ میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ **لا الـــه الاالــلـه مـحـمد رسول الله** کی بجائے اکبر خلیفۃ اللہ کو رواج دیا گیا۔ السلامُ علیکم کی بجائے اللہ اکبر جیسا مہمل جملہ دربار میں عام کیا گیا۔ اکبر کے اس نئے دین کی مخالفت اسکی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اکبر کے اس نام نہاد دین کی بنیاد چونکہ ذاتی اغراض و مقاصد اور شاہی جاہ و جلال پر رکھی گئی تھی اس لئے اسکی موت کے فوراً بعد اُسکی بنیادیں ہل گئیں۔ جہانگیر کے دربار میں اکبر کے دور کی بہت سی رسومات کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن بادشاہ کو سجدہ کرنے کا رواج بدستور قائم رہا۔ اکبر کے مقابلے میں جہانگیر دینی معاملات کے متعلق سُدھ بُدھ رکھتا تھا، اسی لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ شروع میں تو اُس نے مجدد الف ثانیؒ کی مخالفت کی بلکہ اُن کو قید میں بھی ڈال دیا۔ لیکن آخر کار اُسے صداقت کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ مگر دین اسلام کے متعلق جو شکوک و شبہات، غلط عقائد، غلط رسومات اور بدعات راہ پا چکی تھیں، اُن کی روک تھام سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے عہد میں مجدد صاحبؒ نے حکومتی سطح پر یہ خدمت انجام دی اور اُن کے بعد شاہ جہان کے عہد حکومت میں نوشہ گنج بخشؒ نے عوام کو ان لادینی نظریات سے نجات دلا کر انہیں رب رسولؐ کے سیدھے راستے پر لانے کے لئے ان تھک کوششیں کی۔ اس کام کے لئے انہوں نے وعظ و

1- مواعظ نوشہ۔ تیسرا وعظ ص 50

نصیحت کا جوتبلیغی سلسلہ شروع کیا، اُس میں اُن کے مواعظ نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ان مواعظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس کام میں بہت سی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ قدم قدم پر اکھڑ مزاج جاہل اور ضدی لوگوں سے واسطہ پڑا۔ لیکن انہوں نے نہایت عمدہ اخلاق، دھیمے لہجے اور میٹھی زبان میں اُن کو سمجھایا:

''بابا سائیں تے سائیں والیاں نال ڈنگیائی بھلی ناہیں۔ جو آکڑسی، سوا کھڑسی، کسے وڈیائی تے بھلیئے ناہیں۔ پڑھ کلمہ سچ دا۔
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''[1]

اس کے لئے نوشہ صاحبؒ قرآن پاک کے واقعات بیان کر کے لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں، کہ جو شخص حق سچ کی مخالفت کرے گا اللہ کے عذاب سے کبھی نہیں بچ سکے گا۔ قرآن پاک میں مذکور حضرت صالح علیہ السّلام کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بابا! جاں حضرت صالح پیغمبر علیہ السلام نے ثمود تے قوم اوسدی نوں کفر تھوں ہٹکیا سی تاں اوہناں وڈیائی دے غرور نال اوہناں نوں کجھ نہ جاتا تے کہیا نہ منیا تے وَیر پئے۔ تاں کھجاون لگے تے دکھان لگے۔ ڈاچی پیغمبر دی سواری والی نوں پانی پیونوں جھلیونیں تے کوہ کھاون دی صلاح کیتونیں، جو آپے پیغمبر اوکھا ہوسی۔ پر جاں اونٹھنی پکڑ کے کوہ کے ونڈ لیونیں تاں اللہ تعالیٰ کفر تے ظلم دی شامت اوہناں اُتے چھوٹیاں وڈیاں سنے رناں سنے منساں برابر غضب تے قہر کیتا تے عذاب گھلیا۔''[2]

ان وعظوں میں نوشہ صاحبؒ نے جہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس سمویا

1- مواعظ نوشہ (چوتھا وعظ) ص 52
2- ایضاً ص 51

ہے وہاں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھا ہے۔ کیونکہ جب تک حقوق العباد پورے نہ کئے جائیں اُس وقت تک کسی پُرامن ، نیک اور صحت مند معاشرے کی تشکیل دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ چنانچہ خدا کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے ، دُکھی لوگوں کی خدمت کرنے ، بھوکے ننگے لوگوں کی بے لوث مدد کرنے ، تکبر اور غرور سے بچنے ، کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرنے مہمان کی خاطر و مدارت کرنے اور علم حاصل کرنے کے علاوہ ہمیشہ صبر اور تقویٰ کا دامن تھامنے کا درس ان مواعظ کے موضوعات ہیں۔ مثال کے طور پر چھٹے وعظ کا یہ حصہ دیکھئے:

'' سبھ وڈیائیاں تھوں وڈی وڈیائی سائیں دا ہک جانن ہے۔ سائیں دے پیاریاں نال پیار کرن ہے۔ اوہناں دا آکھا سچ ہے۔ آکھے لگا سوچھٹا۔ سوکھالا ہویا۔ جمن ، مرن جیون ، حال سوہنے کیتُس ، سُکھ سُکھ پائیُس ، دھوکھا جھورا گوائیُس ۔ تاں تے سبھسے نال نِروَیر رہنا۔ مندا کسے نہ کہنا۔ دسورا کدیں نہ پینا۔ جے کوئی سائیں نہ کرے تُساں نوں دکھاوے تاں دکھی نہ ہووناں۔ اپنے آپ وچ فضل الٰہی نال ڈاڈھے رہناں۔ سائیں دا دتا ہس سہناں۔ پڑھن نال ونہوار رکھنا۔ روگیاں دی ٹہل کرنی۔ بھکھیاں داقُوت پاؤناں۔ ننگیاں نوں کجناں۔ سبھسے دا بھلا بھالناں۔ سکھاں جالناں ، راج دھن وڈیائی دُکھاں دا مُول ہے۔ لب لوہب نہ کرنا۔ چاوڑتوں پرے رہنا۔ آپ نوں نیواں جھُکا جاناں۔ لوک نیوندے ویکھ کے آکڑ نہیں رہنا۔ وڈا بول نہیں بولناں۔ کسے نال وڈھیکی نہیں کرنی۔ روپ بھیس فقیری دا نہیں چھڈنا۔ جھنڈار پک دار ہے۔ ادھار نہیں چاوناں۔ آیا ونڈ کھاوناں ۔ ڈاڈھے ہینے نال اکو جیہا رہناں۔ سائیں دا جان کے پل پل ساہ گراہ سائیں تھوں منگناں۔ سائیں تھوں وڈا کسے نوں نہ منناں۔ ننگنے نہیں

ہووناں۔ تگّنے پاس نہیں کھڑوناں۔آئے دا آدر کرنا۔کوئی ہووے اپنی
وڈیائی نہیں بھالنی۔ وڈیاں دی وڈیائی بھالنی۔ میں میں نہیں کرنی۔
سائیں سائیں آکھنا۔ واہ مرشد جیو فقرِ مایقین است۔ ذِکر ما کلمہ
طیب۔عبادتِ ماصلوٰت خمس۔علمِ ما قرآن مجید۔کسب ماقناعت۔''

ان مواعظ میں انسانی زندگی اور زندگی سے تعلق رکھنے والے عناصر کا ذکر بھی موجود ہے اور انسان کو زندگی میں میسر آنے والی نعمتوں کا بڑے پیارے انداز میں ذکر کرکے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں اور راحتیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں، لیکن ان سے صرف استفادہ کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کا شکر ادا کرنا انسان پر فرض ہے۔ اگر انسان یہ یاد رکھے کہ روز قیامت اس نے ان تمام نعمتوں کا حساب کتاب بھی دینا ہے تو وہ کبھی بھی کفر کی ذلتوں میں نہیں گرے گا۔ یہاں پہلے وعظ میں سے چند سطور پیش کی جا رہی ہیں۔جن سے نوشہ صاحبؒ کا تبلیغی مقصد پوری طرح واضح ہے:

''بابا! کوئی رات ول ویکھو جو کویں سارے جہان نوں کلو پہر لیندی ہے تے سکھ سواندی ہے۔ تے دن ولوں ویکھو جو روشنائی کرکے سبھسے نوں کم دھندے لاوندا ہے۔ تے بھوئیں ول ویکھو جو کویں قدرت نال وچھائی بکھیری ہے تے چشمے نہراں کھوہ کیویں پیدا کیتے ہین تے پانی وی پاک منزہ کڈھیا ہے تے جیہڑا ڈنگراں ڈھوراں، وہتراں، مرہواں، ماہنواں، پنکھیاں دا اَن گھاہ، ساگ، پھل، پھول اگایا ہے۔ پر بابا جو کجھ سائیں بنایا ہے۔سو تاں تساڈے بھلے، نفع، فائدے واسطے کیتا ہے۔ تے تساڈے وہتراں کان بنایا ہے۔ ایہہ احسان سائیں دے جانو تے منّو۔ نہ تے جاں ڈاھڈا ہول وڈا قیامت دا آوسی۔ تداں کجھ ہوئے سنگسی۔ وڈے میدان وچ سبھ کوئی

آ کھڑ ووسی مر کے جیوسی۔ کیتے دا پھل لے کھاوسی۔تس ویلے ہتھ کجھ نہ آوسی۔ کیتا اگے آوسی۔ جنہاں دوڑ دوڑ بھلیائیاں کیتیاں ہین سے خوشی ہوسن تے جنہاں دوڑ دوڑ مندیائیاں کیتیاں ہین سے افسوس کرسن۔"(1)

مطلب یہ ہے کہ ان مواعظ کا فکری پہلو نہ صرف مذہبی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ سماجی اعتبار سے بہت اہم ہے۔نوشہ صاحبؒ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق ایسے فکر انگیز نکات بیان فرمائے جو ہر مسلمان کے لئے دینی اور دنیاوی اعتبار سے سکون و اطمینان کا پیغام ہونے کے ساتھ ساتھ پُر امن معاشرے کی تشکیل کا سبب بن سکتے ہیں۔

مواعظ نوشہ کی لسانی، ادبی اور تاریخی اہمیت

نوشہ صاحبؒ کے ان مواعظ کی اہمیت تین حوالوں سے مسلمہ ہے یعنی لسانی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے۔

لسانی پہلو: علم لسانیات بظاہر دیکھنے میں جس قدر مشکل اور خشک دکھائی دیتا ہے اسی قدر بباطن دلچسپ ہے۔ اس کے لئے اُس زبان کی شدھ بدھ ہونا لازم ہے جس زبان کا تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔ جب بھی کسی تخلیق کا لسانی تجزیہ کرنا مقصود ہو تو سب سے پہلے اس تخلیق میں استعمال کی گئی زبان کے لسانی نظام کا تجزیہ کیا جائے۔ تا کہ اس حقیقت کا علم ہو سکے کہ تخلیق کار نے تخلیق میں کیا کیا خوبیاں یکجا کر دی ہیں۔ اس کے بغیر نہ تو کسی تحریر کی خوبیاں اور خامیاں کھل کر سامنے آ سکتی ہیں اور نہ لسانی حوالے سے اُس کا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ لسانی حوالے سے کسی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا بھی لازم ہے کہ تخلیق کار کا کس ماحول اور علاقے

1- مواعظ نوشہ ص 37-35

سے تعلق ہے۔ تا کہ پتا چل سکے کہ اُس نے اپنے اردگرد کے ماحول سے کس قدر اثر قبول کیا ہے اور اپنی انفرادی کوششوں سے ماحول کو کتنا متاثر کیا ہے۔ اگر ہم ان مذکورہ اصولوں کی روشنی میں نوشہ صاحبؒ کے مواعظ کا جائزہ لیں تو پہلی بات جو کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نوشہ صاحبؒ نے اپنے ان مواعظ میں نیم لہندا بولی اپنائی ہے۔ اُن کی بولی کو ہم نے ''نیم لہندا'' اس لئے کہا ہے کہ انہوں نے صرف مستقبل کے صیغے کے لئے مرکزی بولی میں '' ہووے گا'' کی بجائے '' ہوسی'' لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح مرکزی بولی کے لفظ اک کی بجائے '' ہک'' استعمال کیا گیا ہے۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں یہ بات واضح کی ہے کہ نوشہ صاحبؒ گجرات کی تحصیل پھالیہ کے رہنے والے تھے اور اُن کے آباؤ اجداد پنن وال پنڈ دادن خان کے باشندے تھے۔ یہ سارا علاقہ ایک طرف پوٹھوہاری اور دوسری طرف پہاڑی بولیوں کے زیر اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مواعظ کی زبان میں ان دونوں علاقوں کی بولیوں کے اثرات موجود ہیں۔ پوٹھوہاری (جسے لہندی بھی کیا جا سکتا ہے) کا اثر الفاظ کے اعتبار سے کہیں کہیں گہرا اور نمایاں ہے۔ مثلاً کر لیا ہیس۔ آ کھیوس یا ڈٹھوس۔ اکٹھے کی بجائے مکٹھے وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود نوشہ صاحبؒ کی زبان کو مکمل پوٹھوہاری نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اُسے مکمل لہندی بولی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سرگودھا ، جھنگ ، ملتان اور ڈیرہ غازیخان کی لہندا بولیوں اور نوشہ صاحبؒ کے وعظوں میں استعمال کی گئی زبان لہندا نما بولی میں بہت زیادہ فرق ہے۔ نوشہ صاحبؒ کے ان مواعظ میں کہیں کہیں بھاشا کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے انت ، دھیرج ، سکھر ، ناہیں ، سبھسے وغیرہ۔ یہ الفاظ صرف نوشہ صاحبؒ نے ہی استعمال نہیں کئے بلکہ اُن سے پہلے اکثر شعراء و ادبا کے ہاں ان الفاظ کا استعمال عام ملتا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ اُس زمانے میں عام مروج تھے۔ عام بولے اور لکھے جاتے تھے۔ جس طرح بابا فرید گنج شکرؒ ، بابا نانک جی اور شاہ حسین کے ہاں کئی ایک شہادتیں موجود ہیں۔ بابا فرید کا یہ شعر دیکھئے:

اِک پھِکا نہ گا لائیں ، سبھس میں سچا دھنی [1]
ہیاؤ نہ کہیں ٹھاہیں ، مانک سبھس امولویں

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ ''سو اللہ سبھے دا ہکو سانجھا ہے۔''[2] یا ''تے دن ولوں ویکھو جو رشنائی کر کے سبھسے نوں کم دھندے لاوندا ہے۔''[3] اسی طرح ان مواعظ میں استعمال کئے گئے الفاظ ''ناہیں'' اور ''وہائے گیا'' اکبر کے عہد حکومت کے قابل ذکر شاعر شاہ حسینؒ کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں۔

ع ایویں گئی وہائے کوئی دم یاد نہ کیتا [4]

O

ع کہے حسین فقیر سائیں دا میں ناہیں سبھ توں [5]

اسی طرح پربت ، سائیں ، اسارن ، سنائیکے ، واٹ ، آہر ، وست ، وغیرہ الفاظ آپ سے پہلے بھی صوفیاء نے بھی انہی معانی میں استعمال کئے ہیں۔ جن معانی میں نوشہ صاحبؒ نے انھیں استعمال کیا۔ اس طرح ان الفاظ کے استعمال کی بنا پر نوشہ صاحب کا فکری اور لسانی رشتہ اپنے دور سے پہلے صوفی شعراء کے ساتھ بنتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند صوفی شعراء کے کلام سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں استعمال کئے ہوئے الفاظ نوشہ صاحبؒ کے مواعظ کی زبان سے ملتے جلتے ہیں:

1- آکھیا بابا فریدؒ نے ص278
2- مواعظ نوشہ ص32
3- ایضاً ص35
4- کافیاں شاہ حسینؒ ص 31
5- ایضاً ص21

اُٹھ فریدا ستیا صبح نماز گزار
جوسر سائیں نہ نیویں سوسر کپ اتار[1]
کوٹھے منڈپ ماڑیاں اسار دے گئے
گوڑا سودا کر گئے گوریں جا پئے[2]

شاہ حسینؒ فرماتے ہیں:

ع بھے صاحب دے پربت ڈر دے میں ہاں کون وچاری[3]
ع کہے حسین سنائیکے اساں خاک دے نال ساونا[4]
ع بولیئے سچ دھرم جھوٹھ نہ بولیئے
جو گورو سے واٹ مریداں جولیئے[5]

سلطان باہوؒ:

شوق دا دیوا بال ہنیر ے متاں لبھی وست کھڑائی ہو[6]

اسی طرح ''ہاؤں'' کا لفظ پنجابی شاعری میں دل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

فریدا جنگل جنگل کیا بھویں ون کنڈا موڑیں[7]
وسے رب ہیالیئے جنگل کیا ڈھونڈیں

نوشہ صاحبؒ نے اسی لفظ کو اپنے وعظ میں استعمال کیا ہے:

''بابا جو کوئی نت مندائی کردا ہے تس دے ہاؤں تے وساری داکٹ

1- آکھیا بابا فریدؒ نے ص216
2- ایضاً ص189
3- کافیاں شاہ حسینؒ، ص80
4- ایضاً ص33
5- آکھیا بابا فریدؒ نے ص288
6- ابیات سلطان باہوؒ ص110
7- آکھیا بابا فرید نے ص162

ہوئیکے ودھدے ودھدے بجھ جاندا ہے۔'' اسی طرح لفظ واٹ بمعنی راستہ کا استعمال ملاحظہ کیجئے:

'' بابا! جے توں واٹ سچی، سدھی، سولی، سوکھی سائیں والیاں دی ملیں تاں کدی نہ تھُڑیں تے کدی نہ تھِرئیں''(1)

لسانی خوبیاں: نوشہ صاحبؒ کے یہ مواعظ خطابی نثر کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے لوگوں کو صراط المستقیم دکھانے کے لئے تحریر کئے ہیں۔ گو کہ انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان مواعظ کا معیار عوام کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتا کہ سننے والے اُن سے مکمل طور پر استفادہ کر سکیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان مواعظ میں ادبی رنگ نمایاں ہے۔ چنانچہ ان مواعظ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جس علاقے میں نوشہ صاحبؒ نے زندگی بسر کی، وہاں کی زبان عام پنجابی سے قدرے کرخت اور موٹی ہے اور لوگ یہ زبان بولتے وقت سخت لہجہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب نوشہ صاحبؒ روزمرہ کے لہجے سے ہٹ کر یہ کہتے ہیں۔ ''بابا! سائیں والیاں فرمایا ہے'' تو اُن کے لہجے میں اس قدر مٹھاس محسوس ہوتی ہے کہ سننے والوں کی پوری توجہ اُن کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔ وہ رب کو سائیں، رب کے پاک اور نیک بندوں کو سائیں والے اور ایک عام بندے کے لیے عزت اور احترام کا لفظ ''بابا'' استعمال کرتے ہیں تو اُن کے مواعظ میں خاص حلیمی اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے جو اُن کے سارے بیان کو شریں اور دلکش بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے وعظوں کے وہ حصے جن میں قیامت کے واقعات اور اللہ تعالیٰ کی قہاری اور جباری کا ذکر ہے دلکش ہیں اور سننے والے اُن کو بڑی توجہ اور غور سے سنتے ہیں اور اپنے گناہوں پر پشیمان ہو کر آخرت کی بھلائی کے لئے سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نوشہ صاحبؒ ایک وعظ میں قیامت کی ہولناکی کو یوں بیان کرتے ہیں:

1- مواعظ نوشہ ص 47

''بابا ہک پھوکا اسرافیل دا بناوٹ ہے ڈھان والا ، جیوندیاں دے مارن والا تے دوجا پھوکا ڈھٹھے اسارن والا تے موئے جوان والا۔ ایہہ وی سبھ حکم نال ہے۔''(1)

اسی طرح اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے قرآنی تلمیحات کے استعمال سے خوبصورت کام لیا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ کے منکرین کو عذاب الٰہی اور جلال ربانی سے ڈرایا ہے۔ پھر خود ہی ان واقعات اور تلمیحات کے بیان کا مقصد بتاتے ہیں:

''ایہہ گلاں سُنیاں سچیاں نوں دھیرج ہوندی ہے۔ جو سائیں سچا سچیاں دی واہر کردا آیا ہے۔''(2)

ان نثری مواعظ میں صرف آخرت کے عذاب اور سزا کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں اپنے سماج کی منفی اقدار کے خاتمے اور مثبت پہلو کو اجاگر کرنے کا مقصد مضمر ہے۔ نوشہ صاحبؒ نے تقریباً ہر وعظ میں یہی انداز اپنایا ہے۔ ان مواعظ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ نوشہ صاحبؒ نے الفاظ کے استعمال میں نہایت کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ لیکن اس اختصار کے باوجود کسی بھی وعظ میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ آپ کی ان تحریروں میں جہاں بھاشا وغیرہ کے الفاظ نظر آتے ہیں وہاں عربی، فارسی زبانوں کے بھی الفاظ اُس زمانے کی لسانی روایت کے مطابق استعمال کئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علاقائی الفاظ بھی اپنے ٹھیٹھ اور اصلی لہجے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لئے ہیں۔ ان مواعظ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ نوشہ صاحبؒ کو الفاظ کے انتخاب اور اُن کے استعمال پر خاص قدرت حاصل تھی۔ اس لئے جہاں جہاں انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر جملوں میں ادبی حسن پیدا کیا ہے، وہاں بے اختیار داد

1- مواعظ نوشہ ص30

2- ایضاً ص34

دینے کو جی چاہتا ہے۔ سا ندر بار کے ٹھیٹ لہجے میں کہیں کہیں ان وعظوں میں شاعرانہ حسن جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت یہ کیفیت نہایت دلکش اور پر لطف بن جاتی ہے جب وہ نثر میں قافیہ پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔ تیسرے وعظ میں سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''بابا! جے توں واٹ سچّی، سدّھی، سوّلی، سوکھی سائیں والیاں دی ملیں تے کدی نہ ٹھُڑیں تے کدی نہ ٹھِڑیں پر ایہہ واٹ سائیں والیاں نال ملیاں، سچے ساتھ رلیاں، سچیاں گلاں سنیاں سمجھیاں، سچیاں دے آکھے لگ ٹریاں چلیاں لبھدی ہے۔ ایویں سکھالی ناہیں لبھدی تے ایہہ جو لوک ہور بھُلے بھرمی ہوئے سمجھی نال بھٹکدے ڈولدے رولدے پھردے ہین تے دھردے لکھے نال گھتھے ہوئے ہین، بھلایاں بھلے ہین۔ وڈیاں بھُلاں وچ پھاتھے ہوئے ہین۔ ایہناں نوں کائی سار سدھ ناہیں۔ ایہہ ایویں بھٹکدے آئے تے بھٹکدے جاوندے ہین.... تے سچی گل ایہو ہے ہور کہانیاں بھلانیاں تے پھلانیاں نگُنیاں ہین۔''(1)

ادبی پہلو

اس میں شک نہیں کہ یہ وعظ ایک خاص مقصد کے تحت لکھے گئے تھے اور ان کو ادبی شہ پارے کے طور پر تخلیق کرنا شاید نوشہ صاحبؒ کا مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی فکر اور نظریات دوسروں تک پہنچانے کے لئے یہ وعظ تخلیق کئے۔ کیونکہ وہ اپنے دور کے عالم فاضل تھے۔ اس لئے اسلامی تبلیغ کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی خدمت بھی خود بخود ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ ان وعظوں میں کئی ادبی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

1- مواعظ نوشہ ص 49-47

جب کسی تخلیق کو ادبی حوالے سے پرکھا جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے تاثر، سلاست اور روانی پر نظر جاتی ہے۔ ان وعظوں میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہیں۔ اگرچہ یہ وعظ آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل لکھے گئے۔ لیکن آج بھی ان کے پڑھنے میں قاری کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہوتا۔ تاثر کا یہ حال ہے کہ وعظ کا پہلا جملہ ہی قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالیتا ہے۔ نوشہ صاحبؒ نے اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے کسی قسم کی تمہید نہیں باندھی بلکہ نہایت روانی سے مقصد بیان کرتے ہیں اس لیے نثر میں گفتگو کی سی روانی ہے۔ مثال کے طور ایک وعظ کے چند جملے دیکھئے:

''بابا! جے کوئی پچھے جو اوہ ساعت کداں ہوسی تاں آ کھیئے۔ سو اوکھا ویلا گُھیا لُکیا ہویا ہے۔ کسے نوں خبر ناہیں۔ جویں موت دا ویلا چھپیا ہویا ہے۔ اللہ باجھ ہور کوئی جاندا ناہیں۔''(1)

اردو زبان کے معروف نثر نگار میر امن کے فن کی یہ خوبی ہے کہ اُن کی نثر میں براہ راست بات چیت کا تاثر اُبھرتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو میر امن سے بہت عرصہ پہلے نوشہ صاحبؒ نے اپنے مواعظ میں گفتگو کا انداز اپنایا تھا۔ وہ براہ راست اپنے قارئین سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ میر امن سے قبل پنجابی زبان نہ صرف بات چیت کی مکمل اہلیت رکھتی تھی بلکہ کئی ایک حوالوں سے ادبی زبان کا درجہ بھی حاصل کر چکی تھی۔ نوشہ صاحبؒ کے مواعظ کا ایک ایک جملہ تاثیر سے لبریز ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ تحصیل پھالیہ کے علاقہ کی زبان عام زبان کے مقابلہ میں کُھردری اور موٹی زبان تھی۔ نوشہ صاحبؒ کا تعلق چونکہ اس علاقہ سے تھا۔ اس لئے اُن کے مواعظ میں اس زبان کا در آنا ایک فطری امر تھا۔ مگر نوشہ صاحبؒ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اُس زبان کو بھی ادبیت عطا کر دی اور اُسے ادبی حسن بخش دیا اس لئے ادبیت اور تاثر کی بنا پر ان کی نثر اعلیٰ درجے کی نثر کی حیثیت اختیار کر گئی۔

1- مواعظ نوشہ ص 38

ان مواعظ کی ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ مدعا نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اردو ادب میں سر سید احمد خان اور مرزا غالب کی نثر کو مدعا نگاری کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن مواعظ نوشہ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پنجابی نثر میں یہ خوبی بہت قدیم زمانے سے ہے۔ جسکی ابتداء نوشہ صاحبؒ کے ہاتھوں ہوئی۔

تاریخی اہمیت

نوشہ صاحبؒ کے مواعظ سے قبل پنجابی زبان میں ایسے صاف ستھرے اور عام فہم زبان کے نثری نمونے نہیں ملتے۔ بعض علماء نے امیر خسرو کی پہیلیوں اور گورو صاحبان کی جنم ساکھیوں کو پنجابی نثر کے قدیم نمونے قرار دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ جیسے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے لکھا ہے کہ بابا نانک دیو جی کی یہ جنم ساکھی اکبر بادشاہ نے سنی تھی:

> ''اک دن بابا نانک بیٹھا تھا ار دھیان کیا۔ جب دیکھے تاں پرمیشر کا سمرن کوئی ناہیں کرتا۔ سبھ مایا کوں لپٹائے پڑی ہے۔ تب بابے نانک کہیا اے پرمیشر تجھ کوں کوئی ناہیں جانتا۔ دھیاتا گاتا سبھ مایا مایا کردی ہے۔ توں اِن کے سر کیا کریں گا جو تیرا جس ناہیں گاوتے۔''(1)

یہ جنم ساکھی 1539ء سے 1556ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اب ذرا امیر خسرو کی بجھارتیں دیکھیں۔

1- چار تھم چلدے جان۔ دو دیوے بلدے جان۔ دو پکھے جھلدے جان۔ اگے بھومیاں سپ لیٹدا جاوے۔

2- عجب ڈٹھی اک کڑی راجے پگ لہائے۔

3- بجھ میرا بجھکا، تینوں باندر لڑے ککا۔

1- پنجابی ادب دی مختصر تاریخ ص 125

4- چونے گچ حویلی بوہا کوئی نہ۔

5- کالو والیاں مجھ چھپائی ۔ اکھو والیاں کڈھ وکھائی ۔ پنجو والیاں نپ وکھائی۔ نہوں والیاں کوہ وکھائی۔

6- آلا بھریا کوڈیاں وچ تو تک نچے۔

7- نکی جیہی کڑی اوہدی جھولی وچ ونڈ ۔ کیوں بھرا پٹیئے کاہدی پائیو ڈنڈ۔

اگر ہم بابا نانک کی جنم ساکھی کا لسانی تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زبان کا جھکاؤ برج بھاشا کی طرف زیادہ ہے۔ اُس میں اگر چہ کہیں کہیں عربی ، فارسی اور پنجابی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن پوری جنم ساکھی میں اُن کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جملوں کی ساخت پنجابی زبان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ جبکہ بابا نانک کے دور اور اُن سے ماقبل دور کی پنجابی زبان بڑی صاف ، رواں اور سادہ ہے۔ اس لئے دن جنم ساکھیوں کو پنجابی نثر کے زمرے میں شمار کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ ان سے قبل بابا فریدؒ اور دیگر پنجابی شعراء کی زبان صاف اور عام فہم ہے۔ بابا فریدؒ کے بعض شلوک تو آج کے دور کی پنجابی زبان میں معلوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ان جنم ساکھیوں میں سلاست ، روانی اور پنجابی ڈکشن ہونا چاہئے تھی۔ ادبی اعتبار سے بھی ان میں کوئی کمال یا ادبی حسن دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے پنجابی نثر کے میدان میں ان کو کوئی مقام دینا مشکل ہے۔

اگر ان جنم ساکھیوں کے مقابلے میں امیر خسرو کی پہیلیوں کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی زبان بڑی صاف ، سلیس اور عام فہم دکھائی دیتی ہے۔ بعض پہلوؤں میں تو آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان پہیلیوں کو پنجابی نثر کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے ہمیں دو باتیں پیش نظر رکھنا ہوں گی۔ پہلی یہ کہ نثر میں روانی ہونا لازمی ہے۔ تسلسل کے ساتھ لکھی گئی نثر میں ایک فقرہ دوسرے کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی مانند مربوط ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ نثر میں

گرائمر کی کوئی غلطی نہ ہو۔ جبکہ شعر میں وزن اور بحر کی مجبوری کی وجہ سے الفاظ کی ترتیب تبدیل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اُس میں صرف وزن اور بحر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ شعر اور نثر کو ایک دوسرے سے ممیّز کرنے والی چیز وزن اور بحر ہے۔ کیونکہ مصرع یا شعر وزن میں ہوتا ہے۔ جبکہ نثر میں جملہ کسی وزن یا بحر میں نہیں ہوتا۔ امیر خسرو کی یہ پہیلیاں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی انداز نثر والا نہیں بلکہ شعر والا ہے۔ کہیں کہیں وزن یا بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ پیمائی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس لئے ان پہیلیوں کو آزاد نظم کہہ سکتے ہیں۔ نثر میں شمار نہیں کر سکتے۔

اس سارے پس منظر میں مواعظ نوشہ کا جائزہ لیں تو ان وعظوں کی زبان میں روانی، سلاست، تاثر اور واضح مطلب جیسی صفات پڑھنے اور سننے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان میں گرائمر و قواعد کی پابندی کی گئی ہے۔ کہیں گفتگو کا انداز اور کہیں خطابی انداز ہے۔ یہ وعظ ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ نوشہ صاحبؒ شاعر بھی تھے۔ اس لئے اُن کی نثر پر کہیں کہیں شاعرانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ خاص طور پر قافیہ بندی خود بخود پیدا ہوگئی ہے۔ جس سے نثر کے حسن میں اضافے کے ساتھ ساتھ تاثیر بھی دُگنی ہوگئی ہے۔ ایسی خوبیوں سے مزین نثر نوشہ صاحبؒ سے پہلے پوری پنجابی ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے اب تک کی تحقیق کے مطابق ان وعظوں کو شاہ جہان کے عہد میں لکھی جانے والی پنجابی نثر کے اعتبار سے قدیم ترین نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔

پنجابی زبان و ادب کا طالب علم ان مواعظ کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اور ان نثری مواعظ کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائیگا کہ پنجابی زبان خصوصاً پنجابی نثر گذشتہ چار صدیوں میں کن کن ارتقائی مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچی ہے اور اس میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔